ڈاکٹر شکیل احمد خاں
اسسٹنٹ پروفیسر
صدر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری بوائز کالج، گلستانِ جوہر، کراچی

# اندرونِ سندھ کے چند نامور اردو مترجم

**ABSTRACT**

**Some famous Urdu translators of Interior Sindh**
**By Dr. Shakeel Ahmed Khan, Assistant. Professor, Head of Urdu Dept. , Govt. Degree Boys College, Gulistan-e-Johar, Karachi.**

The importance of translation work in the science and literature cannot be neglected. With the help of translation, the nations of the world get an opportunity to be familiarized with each other's literature. Due to this reason, transitions are being done at international to increase the scientific and literary capital. In Pakistan, work is being done at the provincial level in this regard as well.

This article, written under the above title, also examines some of the well-known translators from Interior Sindh, like Dr. Hasrat Kasgangvi, Imdad Husani, Naeem ur Rahman Jauher, Aslam Yousuf, Suraiyya Soz Deplai ,Dr. Sadia Naseem, Mahtab Mahboob, and their Urdu translations of Sindhi fiction and novels.

کسی ایک زبان کی عبارت یا متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کہلاتا ہے، ترجمے کے ذریعے ایک قوم کو دوسری اقوام کی تہذیب وثقافت، تاریخ وتمدن، علم و مذہب، زبان وادب، معیشت ومعاشرت اور ان سے وابستہ دیگر عوامل کو سمجھنے اور جاننے کا موقع ملتا ہے، علم وآگہی کا یہ مؤثر اور سستا طریقہ صدیوں سے چلا آرہا ہے اور اسے ایک فن کی حیثیت حاصل ہے، برصغیر میں بھی اسی فن سے استفادہ کرتے ہوئے مذہبی، سیاسی، علمی اور ادبی ضروریات کے تحت مختلف اداروں اور شخصیات نے عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ روسی، فرانسیسی، جرمنی اور ترکی زبانوں کی سینکڑوں کتب اردو زبان میں ترجمہ کیں، اس قیمتی سرمائے کی منتقلی، خصوصاً مغربی زبانوں کے تراجم سے جہاں اردو زبان و ادب کا دامن وسیع ہو، وہاں اس پر دوررس اثرات بھی مرتب ہوئے، اس حوالے سے مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> ''اردو میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی و گیرائی میں اخذ وترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے: مثلاً یہ کہ

ادبی تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا، نئے طرز احساس کو ابھارا، پیرایۂ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال پیدا کیا اور پیرایۂ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے نیز یہ کہ نئی نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو فنی وقار بھی بخشا۔''(۱)

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے ہر خطے اور علاقے میں بولی جانے والی زبانوں اور بولیوں پر خصوصی توجہ دی گئی اور ان کی علمی و ادبی نگارشات کا اردو زبان میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوگیا، یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کو جان سکیں، سمجھ سکیں اور یہ سب اپنی اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک قومی دھارے میں شامل ہوجائیں اور دنیا کے نقشے پر ایک پاکستانی قوم بن کر ابھریں، ایک ایسی قوم جس کا اپنا ملّی، فکری اور نظریاتی بیانیہ ہو۔ علاقائی زبانوں کے ادبی تراجم کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انیس ناگی لکھتے ہیں:

''ملکی ثقافتی ہم آہنگی کے لیے (جب کہ اردو زبان پاکستان کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتی) یہ ضروری ہے کہ علاقائی زبانوں کے ادب کو نہ صرف بین الصوبائی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے بلکہ تمام کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت بھی ہے کہ ایک ہی خطے کے لوگ تمدنی سطح پر ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ اردو زبان کی ترویج و توسیع کے لیے لازم ہے کہ اسے پاکستان کی سرزمین پر اس کے زمینی رشتے سے وابستہ کیا جاسکے اس میں فوک لور، اساطیر اور تہذیبی عناصر کو شامل کیا جاسکے۔ چنانچہ اس لسانی اور ثقافتی ضرورت کے پیش نظر بین الصوبائی ادبی رابطے کے لیے ایسے تراجم کے مستقل ادارے قائم کیے جانے چاہییں۔''(۲)

پاکستان کی علاقائی زبانوں میں سندھی وہ واحد زبان ہے، جس کا اپنا رسم الخط ہے اور محققین اور ماہر لسانیات کے مطابق اس کا تعلق قدیم ہند آریائی زبانوں کے خان دان سے ہے، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اس حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح سندھی بھی اصلاً آریائی زبان ہے۔ یہ ان آریہ قبائل کی زبان سے ارتقا پاکر اپنے موجودہ روپ تک پہنچی ہے جو ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح آکر سندھو ندی کی وادی میں آباد ہوگئے تھے۔ دوسری زبانوں کی طرح یہ بھی قدیم ہند آریائی، درمیانی ہند آریائی اور آخری ہند آریائی کے ادوار سے گزرتے ہوئی یا دوسرے الفاظ میں قدیم پراکرت یا سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش کے مدارج

طے کرتی ہوئی اس مقام تک پہنچی جہاں اسے سندھی زبان کہہ کر پکارا جانے لگا۔''(۳)

سندھ میں قیام پاکستان سے قبل، اردو اور سندھی زبانوں کا میل ملاپ اُس وقت سے شروع ہوگیا تھا جب سندھی شعرا نے اردو میں بھی شعر گوئی کا آغاز کیا تھا اور یہ اردو شاعری کا وہ قدیم ترین دور ہے جو دکنی دور کہلاتا ہے، اس زمانے میں شمالی ہند جو کہ اردو کا مرکز رہا ہے، وہاں بھی اس کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔

''جدید تحقیقات کی رو سے اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر سلطان قلی قطب شاہ ہے جس کا زمانۂ حکومت ۹۸۸ ھ تا ۱۰۲۰ھ ہے۔۔۔تقریباً اسی زمانے میں بکھر (سندھ) میں میر فاضل بکھری اردو شاعری کا چراغ روشن کر رہے تھے۔میر فاضل 'تاریخ معصومی' کے مصنف میر معصوم بکھری کے چھوٹے بھائی ہیں، اور ان کے اردو کلام کی شہادت 'ذخیرۃ الخوانین' سے ملتی ہے۔''(۴)

اردو اور سندھی زبانوں کے رابطے کے بعد ایسے کئی سندھی شعرا اور ادبا ملتے ہیں جنھوں نے اردو زبان کو اپنایا اور اس میں اپنی نگارشات پیش کیں، اس سلسلے کو مزید استحکام اُس وقت ملا جب مملکت پاکستان وجود میں آئی اور سندھ کے اہل زبان نے اردو زبان کی حقیقت کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے اُسے سینے سے لگایا اور معروف سندھی اہل قلم جن میں پیر حسام الدین راشدی، شیخ ایاز، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر ابراہیم خلیل، رشید لاشاری، لطف اللہ بدوی، عبدالرزاق راز، احسان بدوی، عبداللہ خواب، سرور علی سرور، سرشار عقیلی، غلام محمد گرامی، مظفر حسین جوش، تنویر عباسی، ڈاکٹر عبدالمجید سندھی، حمید سندھی، ڈاکٹر غلام علی الانہ، امداد حسینی وغیرہ شامل ہیں، اپنی تخلیقات و نگارشات اردو میں بھی تحریر کیں، اس کے ساتھ ساتھ سندھی ادب کے اردو تراجم بھی ہونے لگے اور اس کام میں سندھی اہل قلم کے علاوہ اردو اہل قلم نے بھی ان کے شانہ بشانہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، سندھ میں ان تراجم سے یہ فائدہ ہوا کہ یہاں کی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور دیگر معلومات سے آگہی ملی، اردو اور سندھی زبانوں کے درمیان لسانی روابط قائم ہوئے، اردو اور سندھی بولنے والوں کے درمیان اخوت، بھائی چارہ اور یکجہتی کا رشتہ مضبوط ہوا اور دونوں زبانوں کے اہلِ قلم ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور انھوں نے مل کر یہاں کی فضا کو سازگار بنایا۔

اس مضمون میں اندرون سندھ سے تعلق رکھنے والے سندھی نثری ادب کے چند معروف مترجم اور ان کے اردو تراجم کو موضوع بناتے ہوئے، تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

**۱۔ ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی:**

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی (۱۹۳۶ء۔۲۰۱۵ء) اُردو زبان و ادب کے علاوہ سندھی زبان و ادب پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔انھوں نے اپنی زندگی کا خاصہ عرصہ اندرونِ سندھ میں گزارا ہے جہاں ان کا براہِ راست تعلق سندھی ماحول، سندھی ثقافت، سندھی زبان اور دیہی علاقوں کے لوگوں سے رہا، اس کے علاوہ وہ یہاں پر تعلیم کی کمی کے نتیجے میں کسانوں اور ہاریوں

پر ہونے والی زیادتیوں، کمزور اور مظلوم عورتوں پر بوسیدہ رسم و رواج کے تحت ہونے والے مظالم اور وڈیروں کے ظلم و جبر کی داستانوں سے بھی آگاہ ہوئے، انھوں نے اس حوالے سے اپنے کئی افسانے بھی لکھے، لیکن انھوں نے زیادہ مناسب یہ جانا کہ سندھ کے حالات، سندھی افسانوں کا اُردو میں ترجمہ کر کے بیان کیے جائیں کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ایک سندھی افسانہ نگار کسی اور کے مقابلے میں یہاں کے حالات و واقعات اور ماحول و معاشرت کو بہتر طور پر سمجھتا اور جانتا ہے اور اچھے انداز میں پیش کرسکتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے سندھی افسانوں کو اردو میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے جن سندھی افسانوں کا انتخاب کیا، وہ اس کا پس منظر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں نے جن افسانوں کا انتخاب کیا ہے ان میں سندھ کی مخصوص تہذیب و تمدن، ثقافت اور ماحول و معاشرے والے افسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ افسانے سندھ کے مخصوص ماحول اور معاشرے کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے سندھ کے اندرونی مسائل کا علم ہوتا ہے۔''(۵)

مذکورہ مضمون میں ایک اور جگہ سندھی کہانیوں کے تراجم کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کہانیوں نے مجھے اور بھی باریکیوں سے متعارف کرایا ہے، سندھ کے افسانہ نگاروں سے ملا ہوں، ان کے مسائل سنے ہیں، ان کی جدوجہد اور کاوشوں پر غور کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی یہ آواز، ان کے یہ مسائل، ان کے سوچنے کا انداز، ان کا خلوص، ان کی جدوجہد اس قابل ہیں کہ ان پر غور کیا جائے، انھیں عام کیا جائے۔''(۶)

ڈاکٹر عبدالحق کا منتخب سندھی افسانوں کے تراجم کا ایک مجموعہ اور چند غیر مدوّن تراجم پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی اشاعتی تفصیل اور جائزہ درج ذیل ہے۔

**۱۔ ''ہم لوگ'' (مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء)**

''چار ایکڑ زمین''(۷) (شیخ ایاز)، ''روشنی کا سفر''(۸) (آغا سلیم)، ''ایسا بھی ہوتا ہے'' (مانک)، ''خبطی''(۹) (بادل جمالی)، ''چھینٹ کا جوڑا'' (قاضی خادم)، ''پھول سرخ ہیں'' (رسول بخش پلیجو)، ''سودا'' (جمال ابڑو)، ''گالی'' (جمال ابڑو)، ''خوں چکاں رات''(۱۰) (سراج میمن)، ''جبر'' (ڈاکٹر غلام نبی سدھایو)، ''ہم لوگ''(۱۱) (علی بابا)، ''ظلم پھر ظلم ہے'' (غلام ربانی آگرو)، ''شریف زادی''، (نورالہدیٰ شاہ)، ''حبس کی ایک رات کا خواب'' (شمس سومرو)، ''کالا تل''(۱۲) (غلام نبی مغل)، ''تضاد''(۱۳) (نسیم کھرل)، ''تین کہانیاں'' (ملک ندیم)، ''اماں میں اسکول نہیں جاؤں گا'' (شیخ حفیظ)، ''عورت ذات'' (عبدالقادر جونیجو)، ''چاندی کے تار'' (ماہتاب محبوب)، ''جلاوطن'' (نورالہدیٰ شاہ)، ''لینس ڈاؤن پل'' (فتاح عابد)، ''شبنم

شبنم کنول کنول،[۱۴] (نسیم کھرل)، ''بدلہ'' (غلام ربانی آ گرو)'' ،[۱۵] ''دو راستے ایک منزل''، (ثمیرہ زرین)، ''سو روپے نوٹ آدمی'' (علی بابا)، ''وطن'' (ثمیرہ زرین)، ''جیجی'' (زرینہ بلوچ)، ''بھاگاں'' (علی بابا)، ''قربتیں اور فاصلے'' (خیرالنساء جعفری)، ''درد کا پاتال'' (شوکت حسین شورو)، ''مکسڈ گرل'' (نسیم کھرل)، ''افطاری'' [۱۶] (محمد ابراہیم جویو)، ''من اُجا تن اُجلا'' [۱۷] (زینت عبداللہ چنا)، ''اندھیری نگری'' (بروہ سندھی)، ''کاراکاری'' (فتاح عابد)، ''مفرور'' [۱۸] (حلیم بروہی)، ''اندھیرا'' [۱۹] (غلام ربانی آ گرو)، ''فرشتہ'' [۲۰] (ایاز قادری)، ''مکومست'' (ع۔ق۔شیخ)، ''جالا'' (ماہتاب محبوب)، ''ان داتا'' (حمید سندھی)، ''غنڈہ'' (بادل جمالی)، ''نیا مردہ'' [۲۱] (غلام ربانی آ گرو)، ''تنقید کی قیمت'' (موہن کلپنا)، ''موچی کاج'' (غلام ربانی آ گرو)، ''بھوک'' (نذیر قاضی)، ''آنسو اور مسکراہٹ'' (محمد یعقوب ایاز)۔

**غیر مدوّن تراجم:**

''طالب المولیٰ کی شاعری'' (ڈاکٹر اسد اللہ حسینی)، ''کافر'' (نسیم احمد کھرل)۔

یہ تراجم رسالہ ''نئی قدریں''، حیدرآباد میں بالترتیب شمارہ (۶۔۵) ۱۹۷۳ء اور شمارہ (۹۔۸) ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے۔

''مریم'' (قاضی خادم) مطبوعہ رسالہ ''قومی زبان''، کراچی، دسمبر ۱۹۹۴ء، کتاب ''پاکستانی ادب، ۱۹۹۴ء''، مرتبین: ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء اور کتاب ''قاضی خادم کے افسانے''، مرتبہ: مرزا سلیم بیگ، حیدرآباد، مکتبۂ نئی قدریں، ۲۰۰۰ء

''مرہم''، مطبوعہ رسالہ ''ماہِ نو''، لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء۔

کسی بھی زبان کی تحریر کا ترجمہ کرنا ایک فن ہے اور ایک اچھے ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ جن دو زبانوں کے درمیان یہ معاملہ ہو ان پر مترجم کی دسترس کا ہونا بہت ضروری ہے اور اگر ترجمہ ادب سے متعلق ہے اور مترجم دونوں زبانوں کے ادب سے بھی آگاہ ہے تو یہ اس کی اضافی خوبی ترجمے کو مزید اچھا بنانے میں نہایت معاون ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی ان دونوں حوالوں سے اپنے کام میں مستند تصور کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہ تراجم ہر خاص و عام میں خاصے مقبول رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق بطور افسانہ نگار اپنی حیثیت پہلے ہی منوا چکے تھے، مگر مترجم کی حیثیت سے جب انھوں نے سندھی افسانوں کو اُردو زبان میں منتقل کیا تو ان کے لیے یہ کام نسبتاً آسان ہو گیا اور انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، واردات و کیفیات اور مشاہدات و تجربات کے نچوڑ کو سندھی افسانوں کی اصل روح، مخصوص مزاج و کیفیات، حالات و واقعات اور ماحول میں ڈھال کر بڑی عمدگی سے اُردو ترجمے کی صورت میں پیش کر دیا۔ اسی طرح زبان و بیان میں بھی انھوں نے پوری کوشش کی کہ سندھی زبان کے الفاظ اور محاورات کا عین متبادل پیش کر سکیں اور اگر کوئی متبادل

دستیاب نہیں ہوسکا تو پھر قریب کے مفہوم کو اختیار کیا اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ترجمہ آسان اور رواں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ اصل سے بہت حد تک قریب ہوگیا ہے۔ سندھی زبان کے بہت سے مانوس لفظوں کو بھی انھوں نے شعوری طور پر ان ترجموں میں برتا ہے۔ ان کی یہ شعوری کوشش اور ترجمے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عصبیت کے خلاف تھے اور سندھی زبان اور اس کے ادب سے بھی اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی اپنی قومی زبان و ادب سے، اس کے علاوہ انھوں نے ترجموں کے ذریعے دونوں زبانوں کو قریب لانے کی کوشش بھی کی۔

ان کی ترجمہ نگاری پر رائے دیتے ہوئے آفاق صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر حسرت کا کمالِ فن یہ ہے کہ نہ صرف اُردو کے قابلِ قدر افسانہ نگار اور بہت ہی پڑھے لکھے تنقید نویس ہیں بلکہ سندھی زبان و ادب پر بھی اتنی دسترس رکھتے ہیں کہ اب تک کئی ممتاز سندھی افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کو بڑی عمدگی سے اُردو ترجموں کی صورت میں پیش کر چکے ہیں، عیاں راچہ بیاں؟ اس کتاب (ہم لوگ) کو پڑھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی جو صلاحیت ہونی چاہیے اس کا ان کہانیوں میں کیا مقام ہے۔۔۔ ڈاکٹر حسرت کے ترجمے پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ انھوں نے سندھی کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد زبان و بیان کی تمام تر خوبیوں کو برقرار رکھتے ہوئے منتخبہ افسانوں کا ترجمہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ یہ ترجمے ہماری نئی ادبی تاریخ کا ایک روشن باب اور قومی یکجہتی کے آئینہ دار ہیں''۔ (۲۲)

**II۔ امداد حسینی:۔**

امداد حسینی (پ۔ ۱۹۴۰ء) سندھی زبان کے ایک معروف شاعر ہیں، انھوں نے سندھی نثر اور شاعری دونوں کو اُردو میں ترجمہ کر کے نہ صرف سندھی ادب کی خدمت کی ہے بلکہ اُسے اُردو پڑھنے والوں میں روشناس کراتے ہوئے اُردو تراجم میں اضافہ بھی کیا ہے۔ سندھی شاعری سے ان کے دو تراجم منظرِ عام پر آئے ہیں، ایک ''دودو چنیسر'' (مطبوعہ ''لوک ورثہ''، اسلام آباد، ۱۹۷۵ء) کے عنوان سے جس میں سندھ کی لوک گائیکی کا شعری ترجمہ کیا گیا ہے۔ دوسرا ''شیخ ایاز اور روح رہان'' (مطبوعہ رسالہ ''ادبیات'' اسلام آباد، جلد ۱۲، شمارہ ۴۷، ۱۹۹۹ء) کے نام سے ہے، اس مضمون میں انھوں نے شیخ ایاز کی شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں انھوں نے سندھ کے مشہور اور ممتاز عالم فاضل، شاعر و ادیب، شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کے ایک قدیم اور مقبول سندھی ناول ''زینت'' کا جو ۱۸۹۰ء میں شایع ہوا تھا، اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کو اکادمی ادبیات اسلام آباد نے ٹھیک نوے (۹۰) سال بعد یعنی ۱۹۸۰ء میں طبع کیا، یہ سندھی ناول کا غالباً پاکستان میں پہلا اُردو ترجمہ

ہے اور یہی نثری ترجمہ ہمارا موضوع بھی ہے۔

کسی بھی مترجم کے لیے اپنے دور یا ماضی قریب کی کسی تخلیق کا ترجمہ کرنا، ماضی بعید کی کسی تخلیق کا ترجمہ کرنے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔ کیوں کہ موجودہ یا قریب کے زمانے کے حالات و واقعات، زبان و بیان مترجم کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ ان متعلقات سے بہت حد تک گزر بھی چکا ہوتا ہے جب کہ زمانۂ قدیم کی کسی تحریر کو ترجمے کی صورت میں پیش کرنے کے لیے اسے اس دور کے نہ صرف حالات و واقعات اور پس منظر کا جاننا ضروری ہوتا ہے بلکہ قدیم زبان، اس کے روزمرہ محاورے، قواعد و املا اور دیگر تاریخی حوالوں تک رسائی حاصل کرنا بھی لازمی ہوتا ہے تب کہیں جا کر ایک مترجم ترجمے کے حق سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو پاتا ہے۔ امداد حسینی بھی ایک ایسے ہی مترجم ہیں انھوں نے بڑی محنت و لگن سے، مذکورہ معاملات میں اپنے وسیع مطالعے اور تجربے کو کام میں لاتے ہوئے، قدیم و جدید سندھی زبان کے علاوہ اُردو زبان پر بھی کما حقہ دسترس کے ساتھ ناول ''زینت'' کو اُردو کے قلب میں منتقل کرنے کی ایک عمدہ اور کامیاب سعی کی ہے۔

سندھی زبان میں لکھا گیا ناول ''زینت'' مرزا قلیچ بیگ کے ابتدائی ناولوں میں سے ہے اور اصلاح کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ جس طرح ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں سے اصلاح کا کام لیا تھا، اسی طرح مرزا صاحب نے سندھ میں اس ناول کے واقعات اور کرداروں کے ذریعے خواتین کی اصلاح اور ان کی تعلیم پر زور دیا تھا اور سندھ کے اس عہد کی مخصوص طرزِ معاشرت بیان کی تھی جسے امداد حسینی نے اپنے فن کارانہ کمال سے اس طرح اُردو کا جامہ پہنایا ہے کہ اس دور کی ایک واضح، جیتی جاگتی اور مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے اور کردار چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں، ملاحظہ کیجیے ترجمہ شدہ ناول کے دو ٹکڑے جن سے اس زمانے میں عورتوں کے حصولِ تعلیم پر ایک عام رائے کیا تھی اور ان کے پردے کا انتظام کیسا تھا؟ پر روشنی پڑتی ہے:

> ''پوچھ گچھ کرنے پر اور تو سب کچھ معلوم ہوسکتا ہے اور ایسا ہمیں پہلے سے بھی معلوم ہے۔ پڑھنا لکھنا تو یہاں کے شرفاء کی ریت ہی نہیں، نہ ہی مجھے ایسی کسی لڑکی کا پتہ ہے۔ بیٹیوں سے نہ تو منشی گیری کروانی ہے اور نہ ہی انھیں کوئی سرکاری نوکری دلوانی ہے جو والدین انھیں تعلیم دلوائیں۔ لے دے کر قرآن اور نماز ہی پڑھیں گی نا۔ تو ان سے وہ لڑکیاں واقف ہیں''۔ (ص: ۱۴)
>
> ''فتح خان کے گھر کا حال اس سے مختلف تھا۔ وہ سرائی لوگ اور پردہ کے سخت پابند تھے۔ تالپور عہدِ حکومت میں جو دستور رائج تھا وہی چلا آ رہا تھا۔ عورت کا باہر نکلنا ان کے ہاں سرے سے ناپسند کیا جاتا تھا جب کبھی ایسی کوئی ضرورت ہوتی تو قنات یا پردہ والی محمل کے بغیر نکلنا محال تھا۔ چاہے فاصلہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ جہاں محمل میں جانا

ناممکن ہوتا تو مجبوراً ڈولی کو استعمال میں لاتے تھے''۔(ص:۲۳)

امداد حسینی نے ترجمے میں ناول کی کہانی کے تسلسل اور روانی کو برقرار رکھتے ہوئے، عام فہم اور آسان زبان استعمال کی ہے اور سندھی زبان کی پرانی کہاوتوں اور ضرب الامثال کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ اُردو کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جیسے: ''یہ بات تو گھی میں گڑ کی سی ہے''، ''غیر کا سونا بھی پیتل ہوتا ہے''، ''آپ نہ پالے کتے پالے''، ''ہتھیلی پر بہشت مانگنے لگا'' وغیرہ۔ البتہ سندھی اور ہندی زبان کے بعض الفاظ مثلاً کمانگری، کارن، سبھاؤ، شبھ گھڑی وغیرہ ترجمے میں داخل ہو گئے ہیں، مترجم اگر چاہتا تو ان کے اُردو میں متبادل الفاظ مل سکتے تھے۔ اسی طرح اُردو کے کچھ الفاظ اور تراکیب کو غالباً سندھی قواعد کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے جیسے جھاڑو پوچا کو جھاڑو پوچی، برا لگے کو غصہ لگے، آگے پیچھے کو آگا پیچھا، خستہ وخراب کو خوار وخراب، بالشت بھر کو چھلانگ بھر وغیرہ۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے علاوہ ترجمہ کسی خامی سے تقریباً مبّرا نظر آتا ہے۔ ناول حالاں کہ اصلاحی اور مقصدی ہے جس سے ناول میں دلچسپی کم ہو جاتی ہے لیکن امداد حسینی کے ادبی اسلوب کی چاشنی کی بناء پر ترجمے میں شروع سے آخر تک دلکشی قائم رہتی ہے۔ مذکورہ ناول میں حیدرآباد شہر کو ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، اس سے متعلق ترجمے کا ایک پیراگراف دیکھیے:

> ''حیدرآباد کے مشرق میں کوس ڈیڑھ کے فاصلے پر ایک بہتر زمین کا ٹکڑا حاصل کیا۔ وہاں استعمال کے قابل ایک کنواں پہلے سے ہی موجود تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا خوب صورت باغ بھی تھا۔ کل ملا کر چھ ایکڑ زمین تھی۔ ڈھائی ایکڑ میں باغ تھا اور ساڑھے تین ایکڑ آبادی کے لیے تھے۔ کنویں کے وسیلہ بھی وہ آباد ہو سکتے تھے اور نہر کے پانی سے شاداب ہو سکتے تھے۔۔۔
>
> یہ مقام ان کے ماں باپ کی پسند کے عین مطابق تھا۔ اس طرح بیٹوں کے سر سے جیسے بھاری بوجھ اُتر گیا وہ ابھی تک شہر کے بنگلوں میں رہتے تھے۔ اتنا عرصہ حیدرآباد میں رہنے کی وجہ سے وہ بھی اس سے مانوس ہو گئے۔ کچھ تو ان کی خواہش تھی اور کچھ لوگوں کا مشورہ تھا کہ 'اگر ہو سکے تو تم بھی سندھ کو اپنا لو۔ یہاں بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی'۔۔۔''(ص:۱۱۱)

مجموعی طور پر یہ ترجمہ زبان و بیان کے لحاظ سے جہاں موزوں تر ہے وہاں اس طور پر بھی اہم ہے کہ سندھ کے ایک قدیم سندھی ناول کو اُردو ترجمے کے ذریعے اُردو ادب کی تاریخ میں محفوظ کر دیا گیا ہے، یہ امداد حسینی کا ایک قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔

### III۔ نعیم الرحمن جوہر:۔

نعیم الرحمن جوہر (پ۔ ۱۹۴۳ء) نے بہ طور مترجم اردو ادب میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ گو کہ ان کی مادری

زبان گجراتی ہے مگر اُردو، انگریزی، سندھی، اور ہندی زبانوں پر بھی کما حقہ دسترس رکھتے ہیں۔

انھوں نے ترجمہ نگاری کے ضمن میں سندھی کے معروف کہانی کار حمید سندھی کی کہانیوں کے اُردو تراجم کیے ہیں، جسے ''سوکھی دھرتی'' کے عنوان سے خود حمید سندھی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب کلاسکس کراچی کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آئی، مذکورہ کتاب میں حمید سندھی ''سوکھی دھرتی کی کہانی میری زبانی'' کے عنوان سے جوہر صاحب کی خدمت کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلے میں اس شخص کا ذکر کروں گا جس نے ان کہانیوں کو سندھی سے اُردو کے قالب میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے میرے کرداروں کو صحیح اُردو بولنا سکھائی جو شاید میں مکمل طور پر نہ کرسکتا۔ وہ شخص نہ صرف اُردو پڑھانے والا استاد ہے بلکہ میرا ساتھی اور دوست بھی ہے وہ ہے نعیم الرحمن جوہر جس کی محنت کے بغیر یہ کتاب مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ جب بھی وہ اور میں میز کے اردگرد بیٹھ کر ترجمے کے لیے سندھی سے اُردو تک کا سفر طے کرتے تھے تو مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ جوہر نہ صرف اُردو اور سندھی بلکہ ہندی، گجراتی اور کئی اور زبانیں بھی جانتا ہے''۔(ص: ۱۴، ۱۵)

جوہر صاحب نے مذکورہ کتاب میں دس سندھی کہانیوں کے اُردو تراجم[۲۳] کیے ہیں، جن کے عنوانات ''سوکھی دھرتی''، ''روشن اندھیرا''، ''دوریاں''، ''دربان''، ''بھاگوان''، ''روپ سروپ''،[۲۴] ''سانوری''، ''جنت''، ''آر پار''، ''ہرنی کی کہانی'' وغیرہ ہیں۔

ان ترجمہ شدہ کہانیوں کے موضوعات سندھ کے دیہات اور ان میں بسنے والے لوگوں کے درمیان روز و شب جاری رہنے والے حالات و واقعات، وہاں کی معاشرت، رسم و رواج، محبت و نفرت، دکھ درد اور خوشیاں ہیں۔ نعیم الرحمن جوہر نے ان کہانیوں کو بڑے عمدہ طریقے سے اُردو زبان میں بیان کیا ہے، وہ دونوں زبانوں کی لفظیات، روزمرہ اور محاوروں پر عبور کے علاوہ شہر اور دیہات کی عملی زندگی سے بہ خوبی واقفیت رکھتے ہیں اور ان تمام معاملات میں ان کا تجربہ اور مشاہدہ ایک وسیع عرصے پر محیط ہے جس کے اثرات ان تراجم میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں، انھوں نے ترجمہ بڑے ڈوب کر، تمام تر احساسات کے ساتھ اور ان کہانیوں کے اصل متن کے عین مطابق پیش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان تراجم میں تخلیق کی سی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں اور اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے مذکورہ کتاب میں شامل کہانی ''کہانی سوکھی دھرتی'' سے طرزِ تحریر کا ایک خوب صورت نمونہ:

> ''پر وہ خون بہاتے بہاتے زمین پر گر گیا، اسے اب ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کے اندر بھی کوئی ٹکریں مار رہا ہے، اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا، اس کے خون کی

بوندیں دھرتی میں جذب ہوتی گئیں۔ اب مانولہو کی برکھا برس رہی تھی کہ ایسے میں یکا یک آسمان سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی، بجلیاں چمکنے لگیں، سب لوگ باہر بھاگے، کالی گھٹاؤں کی تیرگی سارے آسمان پر چھا گئی ایک تو بادل کی گرج اور دوسرے بجلی کی کڑک، چارسو اندھیرا پھیل گیا، بجلی کی کڑک اور چمک نے دلوں کو ہلا دیا، دیکھتے ہی دیکھتے بڑی بڑی بوندیں برسنے لگیں اور بارش بھی ایسی بارش کہ بس آسمان سے چھاجوں برسنے لگا تھا جیسے کوئی چھاج بھر بھر کر پانی پھینک رہا ہو''۔(ص:۳۰)

نعیم الرحمن جوہر کے یہ تراجم ان کے منفرد اور بہترین طرزِ اسلوب کی نمائندہ مثالیں ہیں، فن افسانہ نگاری سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ان کی ان تراجم میں کہیں بھی بے ربطگی، افسانوی اسلوب میں کمی، حالات و واقعات اور منظر نگاری کے بیان میں خامی نظر نہیں آتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی ساخت میں اس بات پر خاص توجہ دیتے ہوئے پوری کوشش کی ہے کہ وہ سہل اور عام بول چال کے ہوں اور تحریر کی روانی میں کوئی دشواری یا رکاوٹ نہ آئے، اس کے باوجود چند نامانوس اور مشکل الفاظ استعمال میں آ گئے ہیں جیسے حقے کی چوبی نے، ہنڈولے، تویی، ہالار، چھاج، جیوڑا، کٹیلے، گچّی وغیرہ۔ دس کہانیوں کے تراجم میں یہ چند الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے اور ہوسکتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ان کے آسان اُردو متبادل ذہن میں نہ آسکے ہوں یا وہ انھیں آسان ہی سمجھتے ہوں، پھر کچھ الفاظ جیسے حقے کی نے، چھاج اور گچّی کے مترادف ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں۔ بہرحال یہ تراجم مجموعی طور پر اپنے منفرد طرزِ تحریر اور ادبی اہمیت کے لحاظ سے بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ ان تراجم سے جہاں سندھ کی دیہی معاشرت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے، ان کے ماحول کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے، وہاں اُردو زبان میں ترجمہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ سندھی رسم و رواج کے ایک منفی پہلو سے آگہی کے لیے مذکورہ کتاب میں شامل کہانی ''جنت'' سے ایک مثالی ٹکڑا دیکھیے، جس میں ایک معصوم اور خوب صورت لڑکی اپنی خاندانی روایت کا شکار ہوکر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتی ہے۔ ساتھ میں جوہرؔ صاحب کا اندازِ بیان بھی ملاحظہ کیجیے:

''میں نے اِدھر دیکھا، وہ نرم و ملائم ریشم جیسے گال اب نہ تھے، اب وہاں وہ گڑھے بھی نہ تھے جنھیں دیکھ کر میں نے کبھی اس سے سوال کیا تھا کہ 'بہن! یہ تمھیں کیا ہوا ہے؟' آج وہاں اُبھری ہوئی ہڈیاں تھیں، سوکھے سیاہی مائل ہونٹ تھے، ویران آنکھیں تھیں۔

'پیارے! دیکھو تو سہی، مجھے کیا ہوا ہے؟'

میرا ہاتھ کانپنے لگا، اسی لمحے ہاتھوں میں جلن بھی محسوس ہوئی۔۔۔ گالوں میں گڑھے کہاں! وہاں تو اب آگ کے الاؤ جل رہے تھے، شعلے تھے، آگ کی لپٹیں تھیں، میں نے ہاتھ ہٹانا چاہا۔۔۔ میرا ہاتھ جل چکا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آگ بڑھتی جا

رہی ہے اور یہ آگ نہ صرف جنت کو جلا رہی ہے بلکہ سارے خاندان اور خاندانی گھر کو بھی جلا رہی ہے۔۔۔ میں نے جنت کے گھر کی طرف دیکھا جہاں مجھے آگ ہی آگ نظر آئی مجھے ایسے لگا جیسے یہ آگ ہمارے گھر سے دور نہیں اور یہ آگ ہر اس جنت، ہر اس معصوم کو جلا ڈالے گی جس کے گھر میں خاندانیت، بڑائی اور کھوکھلے رواجوں کا علَم بلند ہے''۔(ص:۹۹۔۱۰۰)

نعیم الرحمن جوہرؔ نے مذکورہ کہانیوں کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر اسحاق ابڑو کی لکھی ہوئی سیرت النبویؐ کی ایک کتاب ''نورِ نبوت'' (مطبوعہ سلیم انٹر پرائزز، حیدرآباد، ۲۰۰۰ء) کے عنوان سے سندھی سے اُردو میں ترجمہ کی ہے، یہ ترجمہ کیوں کہ دینی نثر سے متعلق ہے اس لیے جائزے میں شامل نہیں۔

**IV۔ اسلم یوسف:**

اسلم یوسف نے اُردو تراجموں کے ذریعے ادب میں اہم خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے سندھ کے نامور ادیبوں کے لکھے ہوئے سندھی زبان و ادب کے مضامین، ان کی کہانیوں اور افسانوں کے علاوہ بین الاقوامی فکشن پر لکھے گئے ان کے مضامین کو سندھی زبان سے اُردو زبان میں منتقل کیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔''جدید سندھی شاعری'' (مضمون تنویر عباسی)، ۲۔''سندھی ناول نگاری کا ابتدائی دور'' (مضمون پروفیسر منگھا رام)، ۳۔''امر جلیل'' (مضمون انور)، ۴۔''پرندہ'' (افسانہ امر جلیل)، ۵۔''مسکڈ گرل'' (افسانہ نسیم احمد کھرل)، ۶۔''نیا سورج'' (افسانہ اللہ بچایو لغاری)، ۷۔''غم کے شگوفے'' (افسانہ طارق اشرف)، ۸۔''کچھ بھی نہیں'' (افسانہ ایشور چندر)، ۹۔''جدید جرمن ناول کا مختصر جائزہ'' (مضمون بشیر موریانی)، ۱۰۔''دھرتی روشن ہے'' (افسانہ آغا سلیم)، ۱۱۔''رئیس خون پیتا ہے'' (افسانہ محمد یوسف پنھور)، ۱۲۔''نسیم کھرل کا فن'' (مضمون رسول بخش پلیجو)، ۱۳۔''ضمیر کے لیے'' (کہانی محمد خاں)، ۱۴۔''لاطینی ناول کا ارتقا'' (مضمون بشیر موریانی)، ۱۵۔''مسئلے کا حل'' (کہانی واشد یوسندھی)، ۱۶۔''نئی ناک'' (کہانی واشد یوسندھی)۔

مذکورہ تراجم رسالہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد میں بالترتیب شمارنمبر ۱ اور ۲ شمارہ (۶۔۵) ۱۹۷۳ء، شمارنمبر ۳ تا ۶ شمارہ (۳۔۲) ۱۹۷۴ء، شمارنمبر ۷، شمارہ (۶۔۵) ۱۹۷۴ء، شمارنمبر ۸، شمارہ (۹۔۸) ۱۹۷۴ء، شمارنمبر ۹ اور ۱۰، شمارہ (۱۲۔۱۱) ۱۹۷۴ء، شمارنمبر ۱۱ اور ۱۲، شمارہ (۲۔۱) ۱۹۷۵، شمارنمبر ۱۳ اور ۱۴ شمارہ (۸۔۷) ۱۹۷۵ء اور شمارنمبر ۱۵ اور ۱۶، شمارہ (۱۱۔۱۰)، ۱۹۷۵ء میں شایع ہوئے۔

اسلم یوسف نے سندھی تراجم کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی اُردو ترجمے کیے ہیں یہ بھی سندھی ادب سے متعلق ہیں۔

۱۔''سندھی ادب میں جدت پسندی'' (مضمون ایم اے صدیقی)، ۲۔''سندھی شاعری اور موسیقی''

مذکورہ تراجم بھی رسالہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد میں بالترتیب شمارہ (۱۲۔۱۱) ۱۹۷۳ء اور شمارہ (۲۔۱) ۱۹۷۵ء میں

شایع ہوئے۔

اسلم یوسف کے مذکورہ تراجم اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ ان کو اُردو اور سندھی دونوں زبانوں سے بے حد محبت ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک طرف اُردو تراجم کے ذخیرے میں اہم اضافہ کیا تو دوسری طرف سندھی ادب کے عظیم سرمائے کو اُردو ترجمے کے ذریعے ایک بڑے حلقے میں متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ اُردو ادبی حلقے سندھی زبان و ادب میں ہونے والی تبدیلی و ترقی، جدیدیت کے اثرات، سندھی کہانیوں اور افسانوں میں برتے جانے والے موضوعات اور ان میں فنی لحاظ سے ہونے والا ارتقا اور تنوع سے آگاہ ہوسکیں، اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ سندھی ادبا نہ صرف اپنے ادب سے وابستہ رہتے ہیں بلکہ بین الاقوامی ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہوئے ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ادب کو مزید بہتر بنانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

اسلم یوسف خود بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور اُردو، سندھی، انگریزی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ان ہی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے مذکورہ ترجموں کو بڑی عمدگی کے ساتھ اُردو کا جامہ پہنایا ہے اور فنّی و ادبی اسلوب کے لحاظ سے اچھے ترجمے پیش کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے مضمون ''جدید سندھی شاعری'' کے اُردو ترجمے سے ایک اقتباس:

> ''جدید شعر کی ایک اور خصوصیت کلاسیکی ادب کے ورثوں کی حفاظت کرنا ہے۔ ہمارے کلاسیکی شعرا، شاہ، سچل، سامی اور حمّل وغیرہ کی شعری ہیتوں مثلاً بیت، کافی وغیرہ کو جدید شعرا نے ازسرِ نو زندہ کیا ہے۔ آج کل بیت، کافی اور دوہے وغیرہ دو مختلف طریقوں سے لکھے جا رہے ہیں۔ ایک گروہ نے ہیئت کے ساتھ ساتھ ان میں موضوع، زبان اور اسلوبِ بیان کا کلاسیکی انداز برقرار رکھا ہے جب کہ دوسرے گروہ نے ہیئت تو پرانی ہی رکھی ہے لیکن موضوعات اور اسلوب کی بندش کو ختم کر دیا ہے۔''(۲۵)

ترجمے کو اچھا اور مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ زبان آسان اور سادہ اختیار کی جائے تاکہ ہر طرح کا قاری اس سے مستفید ہوسکے، اس کے لیے لازمی ہے کہ زبان اور اس کی لفظیات کا مطالعہ وسیع ہو، اسلم یوسف اس حوالے سے بڑے کامیاب دکھائی دیتے ہیں، ان کے ترجموں میں نہ کوئی اُردو کے غیر معروف یا ثقیل الفاظ شامل ہیں اور نہ انھوں نے سندھی زبان کے مانوس یا نامانوس الفاظ استعمال کرنے کی عمداً کوئی کوشش کی ہے، البتہ انگریزی اصطلاحات مع ترجمہ جوں کی توں رکھی ہیں مگر اس طرح کہ ترجمے کی روانی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی لیے یہ تراجم بڑے رواں اور عام فہم ہیں اسی طرح آپ کی افسانوی طرزِ تحریر اور بیان کی لطافت کی وجہ سے ان تراجم میں جو دلکشی اور تاثر پیدا ہوگیا ہے وہ قاری کو آخری وقت تک اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے۔ افسانہ ''دھرتی روشن ہے'' سے ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

''ٹیکسی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی، میں نے آنکھیں اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ساری کائنات کو رات کی تاریکی نے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ میں نے نظریں جھکا کر سامنے دیکھا ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی، آنکھیں جھپکتے ہوئے نیون سائن، دودھیا اسٹریٹ لائٹس اور کاروں کی تیرتی بہتی ہوئی روشنیاں۔
کائنات کتنی اندھیری ہے اور انسان کی دھرتی کتنی روشن ہے۔''(۲۶)

اسلم یوسف کے یہ تراجم اُردو سندھی دونوں زبانوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتے ہیں جس سے دونوں کے درمیان ادبی اور لسانی سطح پر ایک مضبوط رشتہ استوار ہوتا ہے اس کے علاوہ یہ ترجمے دونوں ادبیات کی ترویج اور فروغ میں بڑے مفید اور مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

**V۔ ثریا سوز ڈیپلائی:۔**

ثریا سوز ڈیپلائی (۱۹۴۴ء۔ ۲۰۰۴ء) سندھی شاعری اور سندھی افسانہ نگاری میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے اپنے والد محمد عثمان ڈیپلائی کے ایک سندھی ناول ''سانگھڑ'' کا اسی عنوان سے اُردو ترجمہ کرکے نہ صرف اُردو قارئین میں اسے متعارف کرایا بلکہ اس کے ذریعے اُردو، سندھی زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان باہمی تعلق اور مضبوط رشتے کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

ناول ''سانگھڑ'' کا ترجمہ فکشن ہاؤس، لاہور نے ۲۰۰۲ء میں شایع کیا۔ سندھی ناول ''سانگھڑ'' سندھ کا مقبول ترین اور زیادہ پڑھا جانے والا ناول رہا ہے، اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے اُردو زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ محمد علی ڈیپلائی جو محمد عثمان ڈیپلائی کے صاحبزادے اور مترجم کے بھائی ہیں، ناول کی شہرت اور ترجمے کی بابت مذکورہ کتاب میں ''گزارش'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''پاکستان رائٹر گلڈ سے بہترین سندھی ناول کا اعزاز پانے والا یہ ناول گزشتہ چالیس سال سے سندھی قارئین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ حال ہی میں اس کا تخلیص شدہ ایڈیشن شایع ہوا ہے جس کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے''۔(ص:۷)

''سانگھڑ'' ایک تاریخی نوعیت کا ناول ہے، جس میں سندھ کے حروں کی انگریزوں کے خلاف جدوجہد اور مزاحمت کی داستان بیان کی گئی ہے، اس داستان میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہونے والی ناانصافیوں، بنیادی حقوق کی پامالی، انگریزوں کا ساتھ دینے والے وڈیروں اور زمین داروں کی ظلم و زیادتی، اس کے نتیجے میں برپا ہونے والی حر مجاہدین کے تحریکِ آزادی، اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے سندھ کے غریب ہاریوں کی تحریک میں شمولیت اور ان کے جہاد و قربانی

پر مبنی واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ثریا سوز ڈیپلائی نے ناول کی کہانی و حالات کو بڑی توانائی، مستعدی اور مہارت سے اُردو کا لبادہ اُوڑھایا ہے اور ایک ایک لفظ اور جملے پر توجہ دیتے ہوئے اس کے صحیح محل اور مقام پر برتا ہے۔ اسی طرح ان کے فنِ افسانہ نگاری کے تجربے اور مشاہدے نے جہاں مکالموں کو جاندار اور پرتاثیر بنایا ہے وہاں کہانی کے تسلسل اور ربط کو بھی بڑے سلیقے سے برقرار رکھا ہے۔ ملاحظہ کیجیے مذکورہ ناول کے ترجمے کا ایک ٹکڑا جس میں ایک غریب، بے بس ہاری اور زمین دار کی گفتگو سے ماضی میں سندھ کے حقیقی حالات کا علم ہوتا ہے:

> ''۔۔۔'اس کی بیوی کو ساتویں مہینے میں بچہ کی تکلیف ہوگئی ہے۔ اچانک ایسی پریشانی لاحق ہوئی تو یہ آپ سے کچھ رقم لینے حاضر ہوا ہے۔ فجر کی اذان سے آپ سے ملنے کے جتن کر رہا ہے تاکہ بیوی کی دوا دارو کا انتظام ہوسکے لیکن آپ سے ملنا ممکن ہی نہ ہوسکا۔'
>
> 'شادی کرنے کے لیے مدد، پیٹ بھرنے کے لیے مدد، اگر اپنی مدد آپ کرنے کی ہمت نہیں تو شادی کرتے ہی کیوں ہو؟'
>
> خدا جانے یہ الفاظ سن کر گاموں میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی بھڑک کر کہہ اُٹھا 'قسمت سے کوئی کنواری بچتی ہے، تو کیا اسے بھی رئیسوں اور ان کے کمداروں کے لیے چھوڑ دیں؟'
>
> یہ الفاظ نہیں گولی تھے اور بالکل نشانے پر لگے تھے کیوں کہ حاجی صاحب نے بھی بڑھاپے میں ایک غریب، مسکین ہاری پر 'ترس' کھاتے ہوئے اس کی نوخیز بیٹی سے شادی کر لی تھی اور اُڑتے اُڑتے لوگوں تک یہ بات بھی پہنچ گئی تھی کہ جناب کے 'ولی عہد بہادر' کی بھی کسی 'کنواری کلی' پر نظر ہے۔ اس کے علاوہ کمدار کے پاس دو ایک داشتاؤں کا ہونا تو لازمی امر تھا''۔(ص:۲۶۔۲۷)

اُردو اور سندھی ناول اپنی ہیئت و عناصر میں تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں اور دونوں ہی انگریزی فکشن سے مستعار و متاثر ہیں، صرف زبان کے فرق کی وجہ سے اُردو یا سندھی ناول کہلاتے ہیں، ثریا سوز نے اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذکورہ ناول کے ترجمے میں دیگر جزوئیات کی بہ نسبت اپنی پوری توجہ زبان و بیان پر دی ہے اور اُردو زبان پر اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پوری کوشش کی ہے کہ طرزِ تحریر میں سلاست، سادگی اور روانی قائم رہے اور زبان اُردو روزمرہ اور محاورے کے عین مطابق ہو، اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول ترجمہ شدہ لگنے کی بجائے اُردو ناول کا گمان پیدا کرتا ہے۔ ناول ''سانگھڑ'' سے ملاحظہ کیجیے پیر صاحب پگارا اور جی ایم سیّد کی تاریخی گفتگو اور

خیالات، ممکن ہے یہ گفتگو حقیقت پر مبنی ہو:

''ان واقعات کے فوراً بعد مسلم لیگ کے اس وقت کے روحِ رواں جی ایم سیّد وفد لے کر آئے اور پیر صاحب سے کہا:

'آپ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں'۔

پیر صاحب نے مسکرا کر پوچھا 'کس لیے؟'۔

'اس لیے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے مطابق وطن کو آزاد کرایا جائے'۔ سیّد صاحب نے جواب دیا۔

پیر صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا 'مسلم لیگ وطن آزاد کرائے گی؟ شاہ صاحب میں تو آپ کو بڑا سیاستدان سمجھتا تھا لیکن آپ تو شاید سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں!'۔

آپس میں بے تکلفی تو تھی ہی مسکرا کر سیّد صاحب نے کہا:

'اور شاید مختلف جیلوں میں رہ کر، مختلف سیاستدانوں سے مل کر ساری سیاست از بر کر گئے ہیں'۔

'سیاست کی ازبری کا تو ہم دعویٰ نہیں کرتے لیکن جو جماعت ہر قدم انگریزوں کے مشورے سے اُٹھائے اور جس جماعت میں سر، خان بہادر، وڈیرے اور سیٹھ شامل ہوں، وہ اگر آزادی کا دعویٰ کرے تو اچھا مذاق ہے! یہ بات بھی لکھ رکھیں'۔

شاہ صاحب نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا 'پیر صاحب! ہم تو جلد ہی اسمبلی سے پاکستان کی آزادی کی قرارداد بحال کروائیں گے'۔۔۔''۔(ص:۸۸۔۸۹)

جب کوئی مترجم اپنی زبان کی کسی تخلیق کو دوسری زبان میں منتقل کر رہا ہوتا ہے تو اپنی زبان کے بہت سے الفاظ جنھیں وہ خود اپنے ماحول کے پس منظر میں آسان اور عام فہم سمجھتا ہے، ترجمے کی زبان میں داخل کر دیتا ہے۔ بعض مرتبہ یہ کام رواروی یا انجانے میں ہو جاتا ہے جب کہ بعض مرتبہ یہ عمل عمداً یا جان بوجھ کر کیا جاتا ہے جس سے مترجم کا مقصد کچھ اور نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اس کی زبان پھلے پھولے، دوسری زبانوں میں اس کے الفاظ شامل ہوں اور زبان کو وسعت ملے۔ اس ناول کے ترجمے میں بھی ایسے بہت سے سندھی الفاظ جیسے وارابندی، سرڑیاہاری، بابا بھلی ولایت، کھتبے کی بندی، بوزانوں، گدیلے، بھوتار، آئٹھے، بھیڑھی، اوسٹر، کھرے، لوڑھے وغیرہ مل جاتے ہیں۔ ثریا سوز نے یہ کوشش انجانے میں کی ہے یا عمداً یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ البتہ کچھ سندھی الفاظ کے مفہوم و معنی قوسین میں ضرور دیے گئے ہیں، یہ ایک مثبت پیش رفت ہے جس سے

ترجمے کو سمجھنے میں آسانی رہتی ہے۔ ترجمہ شدہ ناول کی ایک اور خصوصیت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے اشعار اور ان کا اُردو ترجمہ ہے۔ جو سیاق و سباق کے پس منظر میں بڑا لطف دیتے ہیں۔ مجموعی حیثیت میں یہ ترجمہ زبان کے عمدہ برتاؤ کے علاوہ ایک اہم کارنامہ بھی ہے جس کے ذریعے سندھ کے حروں کی جدوجہد آزادی کی تاریخ دوسری زبان میں بھی محفوظ ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی مذکورہ ناول میں ''دیباچہ'' کے عنوان سے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُردو زبان میں اس ناول کا ترجمہ اس لیے ایک اہم قدم ہے کہ یہ سندھ میں رہنے والے اُردو داں طبقہ کو اس تحریک سے روشناس کرائے گا جو حروں نے انگریزوں کے خلاف چلائی تھی۔ مزاحمت کا یہ سبق سندھی اور اُردو بولنے والے دونوں طبقوں کے لیے انتہائی ضروری ہے، انھیں اپنے حقوق کی جدوجہد مل کر کرنی چاہیے اور ساتھ ہی یہ سبق بھی سیکھنا چاہیے کہ بالادست حکمرانوں کی گرفت سے کیوں کر آزاد ہوا جائے''۔ (ص: ۴)

**VI۔ ڈاکٹر سعدیہ نسیم:**

حیدرآباد سندھ کا ایک ایسا شہر ہے جس میں سندھی اور اُردو بولنے والوں کا تناسب تقریباً یکساں ہے پھر ان کا رہن سہن، ملنا جلنا، تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، گفتگو اور بول چال بھی قریباً ایک جیسی ہے۔ اندرونِ سندھ کے لوگوں کی آمدورفت بھی تجارت کی غرض سے اس شہر میں ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح یہاں کے لوگ مذکورہ معاملات کو جس طرح سمجھتے اور جانتے ہیں ایسی صورتِ حال سندھ کے دوسرے شہروں میں کم کم ہے۔ اس صورتِ حال کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو حیدرآباد کے لوگ اُردو سندھی زبانوں کے تراجم کی روایت کو بڑے بہتر طریقے سے نبھا اور پروان چڑھا سکتے ہیں اور وہ ایسا کر بھی رہے ہیں، ایسے ہی لوگوں میں ڈاکٹر سعدیہ نسیم کا بھی شمار ہوتا ہے انھوں نے ترجمے کی اہمیت، دونوں زبانوں کی وسعت، ان کی تہذیب و ثقافت کے ملاپ کو سمجھتے ہوئے اور سندھ دھرتی کے حق کو خود پر قرض جان کر ترجمے کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

> ''مجھے دلچسپی اور خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں اس سرزمین کے ادب و کلچر کو ان لوگوں سے متعارف کرانے کا باعث ہوں جو براہِ راست اس زبان سے ناواقف ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں دونوں زبانوں اور دو تہذیبوں کا سنگم ہوں یا میں گویا ایک پُل ہوں جو دو تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر، ایک دوسرے میں ضم کرنے کا باعث ہے تاکہ دوریاں مٹ جائیں اور اس انضمام سے تہذیب و ثقافت اور زبان کی وسعت و ارتقاء کے نئے سوتے پھوٹیں۔ نئے نئے موضوعات اپنی دلکشی اور تنوع لیے ہوئے سامنے آئیں اور اظہار و ابلاغ کے نئے نئے اسالیب اور فکر و فن کے نئے نئے سانچے دونوں زبانوں میں ڈھل کر علم و آگہی کے

وسیع تر تناظر فراہم کریں۔''(۲۷)

مذکورہ اقتباس سے ان کے ترجمہ کرنے کے مقاصد، نیک نیتی اور خلوص واضح ہوجاتا ہے، انھی مقاصد کو عملی جامہ پہناتے ہوئے انھوں نے تراجم کے ذریعے سندھی زبان کی کئی کہانیوں اور افسانوں کو اُردو زبان کے قلب میں ڈھالا ہے، اس حوالے سے غالباً وہ حیدرآباد کی واحد اور پہلی خاتون مترجم ہیں جنھوں نے اب تک سب سے زیادہ سندھی سے اُردو میں ترجمے کیے ہیں۔ یہ ایک قابلِ ستائش بات ہے جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔

ذیل میں ان کے تراجم کی اشاعتی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ قاضی خادم سندھی ادب کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا اُردو ترجمہ ''قاضی خادم کے افسانے'' کے عنوان سے کتابی صورت میں مرزا سلیم بیگ نے مرتب کیا ہے، یہ کتاب مکتبۂ نئی قدریں حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سعدیہ نسیم کے تیرہ (۱۳) اردو تراجم بہ عنوان ''سکون''،(۲۸) ''ہاں سائیں جی سائیں پرسائیں''، ''بھاڑے کا ٹٹو''،(۲۹) ''اناڑی''، ''اب اُٹھ''، ''گم شدہ سر''، ''بلاعنوان''، ''میرا وجود میرے اُصول''،(۳۰) ''بیوٹی گرل''، ''احساس کا سفر''، ''صدیوں کا سودا''، ''پھر رات آئی'' اور ''لالہ صحرائی'' شامل ہیں۔

۲۔ سندھی ادبی بورڈ جام شورو نے ''لوک کہانیاں (حصہ اوّل)'' کے عنوان سے ایک کتاب ۲۰۰۷ء میں شایع کی ہے۔ کتاب میں شامل تمام لوک کہانیوں کے تراجم ڈاکٹر سعدیہ نسیم نے کیے ہیں۔ ان تراجم کے عنوانات یہ ہیں:

''گل انداز بادشاہ''، ''گل بادشاہ، شوق شہزادہ''، ''محمود شاہ''، ''ڈھول شہزادہ (پیارا بادشاہ)''، ''لال ملوک بادشاہ''، ''امیر حمزہ اور کنک رانی''، ''سنہرے بالوں والی شہزادی''، ''کرمان اور کوری بادشاہ''، ''بھاگوان بادشاہ''، ''بادشاہ اور چرواہا''، ''بامراد بادشاہ (اُمید بھرا بادشاہ)''، ''نور شاہ بادشاہ''، ''جمڑو بادشاہ''، ''چوبول رانی''، ''انبولھ رانی''، ''لال شہزادہ''، ''کوڑھی بادشاہ''، ''کدو شہزادہ''، ''سورج شہزادہ اور چاند شہزادہ''، ''شہزادہ اور فقیر''، ''فقیر اور شہزادی''، ''افیمی بادشاہ''، ''سیانا بادشاہ''، ''ولایت شاہ''، ''سورم راجا اور بیکھٹ راجا''، ''شاہ بھی ہو تو چکی پیسے''، ''لعل بادشاہ اور ہیرا رانی''، ''شہزادہ لال ملوک''، ''گنگل رانی''، ''غیبی رانی''، ''شہزادہ تاج الملوک''، ''شہزادہ ساعت ملوک''، ''گنجا فقیر اور گلشن شہزادی''، ''عقلمند شہزادہ''، ''شیر مار شہزادہ''، ''ٹھکرایا ہوا شہزادہ''، ''شہزادہ لعل اور شہزادی لعلان'' اور ''شہزادہ اور شہزادی''۔

ان کے علاوہ ان کے کچھ تراجم مختلف رسائل میں بھی شایع ہوئے:

''بھوکی'' (قاضی خادم) مطبوعہ رسالہ ''نئی قدریں''، حیدرآباد، شمارہ (۸۔۹)، ۱۹۸۳ء

''یقین کی شکست'' (شوکت حسین شورو)''، مطبوعہ رسالہ ''اظہار''، کراچی، مارچ اپریل، ۱۹۸۴ء

''سورما'' (قاضی خادم) مطبوعہ رسالہ ''قومی زبان''، کراچی، دسمبر ۱۹۸۴ء

''پردیسی'' (قاضی خادم)، ''آموں'' (قاضی خادم)

یہ تراجم روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں بالترتیب ۴/اپریل ۱۹۸۴ء اور ۲۰/نومبر ۱۹۸۵ء میں شایع ہوئے۔

''اُجالا'' (امر جلیل)، ''۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء'' (خیر النساء جعفری)، ''میں وہی مارئی'' (ثمیرہ زریں)، ''موڑ'' (طارق اشرف)

یہ تراجم رسالہ ''تخلیق''، لاہور (سندھی ادب وثقافت نمبر) ۱۹۸۸ء میں شایع ہوئے۔

''تکون'' (عبدالجبار جونیجو) مطبوعہ رسالہ ''نئی قدریں''، حیدرآباد، کتابی سلسلہ نمبر ۳۔۴، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۴ء

''حسّو چاچا'' (۳۱) (فارغ بخاری)، مطبوعہ مجلہ ''پرکھ''، جام شورو، شعبۂ اُردو، جامعۂ سندھ، (پاکستانی ادب نمبر)، ۱۹۷۸ء۔

ڈاکٹر سعدیہ نسیم نہ صرف سندھی زبان وادب پر کمال مہارت رکھتی ہیں بلکہ سندھ کے شہری و دیہی ماحول، یہاں کے حالات و واقعات اور مسائل و معاملات سے بہ خوبی آگاہ ہیں، اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک معروف افسانہ نگار ہیں اور افسانے کے فن کو بہتر طور پر سمجھتی ہیں۔ ان ہی صلاحیتوں اور خصوصیات کے سبب ڈاکٹر سعدیہ نسیم کے یہ تراجم بڑے معیاری، خوب صورت اور کامیاب گردانے جاتے ہیں۔

زیادہ تر مترجم اپنے تراجم کے لیے سندھ کے دیہی علاقوں کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ شہر کے لوگ جو اس ماحول سے ناآشنا ہیں، ان میں دلچسپی لیں اور وہ ان سے داد سمیٹیں، لیکن یہ ایک محدود سوچ ہے جو تصویر کا صرف ایک رُخ دکھاتی ہے۔ اس سے جہاں شہری ماحول میں لکھے گئے سندھی افسانوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، وہاں ترجمہ نگاری کی صنف بھی وسعت پذیر اور اعلیٰ معیار کی حامل نہیں ہوتی، ڈاکٹر سعدیہ نسیم نے اس محدود سوچ کو رد کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کے تراجم میں دیہات اور شہر دونوں طرح کے ماحول کے افسانے اور کہانیاں شامل ہوں، اس حوالے سے انھوں نے قاضی خادم کے زیادہ تر وہ سندھی افسانے لیے ہیں جو سندھ کے شہری علاقوں کے علاوہ ملک کے دیگر شہروں اور بیرونِ ملک سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ کوئٹہ کے پس منظر میں لکھے گئے ایک افسانے ''اب اُٹھ'' جو کتاب ''قاضی خادم کے افسانے'' میں شامل ہے، کا ترجمہ شدہ ایک پیراگراف دیکھیے:

> ''اواخر جون کی بات ہے، شام کے چھے بجے ہوں گے، میدانی علاقوں میں تو گرمی کی شدت تھی لیکن کوئٹہ کی وادی پر گہرے گہرے مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی، میٹھی میٹھی ٹھنڈک نے ماحول کو ڈھانپ لیا تھا، خاص طور پر شام کے وقت تو سوئیٹر کی ضرورت محسوس ہوتی۔ بادلوں کے قافلے تھے کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے اُبھرتے ہوئے، چھڑکاؤ کرتے گزر جاتے۔ کبھی کوہ مردار کے عقب سے اُٹھتے، آپس میں ٹکراتے، کڑکڑاتے،

گرجتے، بجلی کوندتی اور وہ برسے بغیر ہی آگے بڑھ جاتے۔''(ص:۳۹)

لوک کہانیوں کا ترجمہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس میں قدیم زبان کے الفاظ اور اصطلاحات ہوتی ہیں جن کا بعینہٖ ترجمہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے لازمی ہے کہ مترجم قدیم زبان کے ساتھ ساتھ، لوک ادب، اس کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور اقدار پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ ڈاکٹر سعدیہ نسیم ان تمام صلاحیتوں سے متصف ہیں۔ انھوں نے سندھ کے قدیم سندھی شعرا جنھوں نے اُردو میں بھی شاعری کی ہے ان پر لسانیاتی تحقیق کے تحت ایک مقالہ بہ عنوان ''سندھ میں اُردو شاعری کی لسانی خصوصیات''(۳۲) بھی لکھ چکی ہیں۔ ان تراجم میں انھوں نے انھی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سندھ کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والی سندھی لوک کہانیوں کے اردو ترجمے کیے ہیں۔ یہ ایک بڑا اور عظیم کارنامہ ہے۔ ادارہ سندھی ادبی بورڈ جام شورو نے جس اعتماد کے ساتھ ان کو یہ کام تفویض کیا، اس بات کا مظہر ہے کہ وہ ان کی صلاحیتوں پر یقین رکھتے تھے۔ ان تراجم کے متن میں انھوں نے سندھی زبان کے آسان اور مانوس مروجہ الفاظ استعمال کرنے کی شعوری کوشش کی ہے تاکہ لوگ سندھی زبان سے واقفیت حاصل کرسکیں اور جب یہ الفاظ اردوداں طبقے میں زبان زدعام ہوجائیں گے تو اُردو زبان کے ذخیرے میں بھی نئے الفاظ کا اضافہ ممکن ہوسکے گا اور سندھی زبان بھی ترقی کرسکے گی۔ ملاحظہ کیجیے کتاب ''لوک کہانیاں'' سے مختلف کہانیوں کی چند سطریں جن میں مرکز لگے الفاظ سندھی زبان سے تعلق کی نشاندہی کررہے ہیں:

''اوپر کچھ پریاں چوپڑ کھیل رہی تھیں۔ اتفاق سے ایک گوٹ نیچے گرگئی، شہزادہ نے فوراً اسے اُٹھا کر کیسہ میں رکھ لیا۔''(ص:۴۸)

''اس نے دوستی نہیں نبھائی اور سنگت چھوڑ کر بھاگ گیا''۔(ص:۹۴)

''بادشاہ کا حکم تھا کہ جو بھی باہری آدمی آئے''۔(ص:۹۵)

''ایک گوٹھ میں ایک غریب آدمی رہتا تھا''۔(ص:۱۰۶)

''لٹکی ہوئی شہزادی کو اُتارا، چنگا بھلا کیا اور اس کا حال احوال پوچھا''۔(ص:۱۶۱)

''اس پر وزیر کو بہت خار لگی اور اسے اندھیری کوٹھری میں بند کردیا''۔(ص:۲۶۲)

''تلوار کے بیچ میں ایسے حسین چھوکرے کو کیوں لے جارہے ہیں''۔(ص:۲۶۴)

''آج اس پاڑے کے ایک گھر سے اناج مل گیا''۔(ص:۲۷۳)

''وہاں بہڑاڑی میں ایک جگہ گمنام رہ کر، محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنے لگی''۔(ص:۲۷۷)

ڈاکٹر سعدیہ نسیم نے افسانوں اور کہانیوں کے تراجم میں ایک تخلیقی شان پیدا کردی ہے اور ان کو پڑھ کر طبع زاد تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ زبان و بیان پر مکمل دسترس ہونے کے باعث سہل، رواں اور عام فہم ترجمہ کیا ہے کسی بھی مقام پر کوئی اُلجھن یا رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی اور قاری ایک تسلسل اور دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان تراجم میں انھوں نے جو سندھی

الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے بھی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی اس کی تفہیم میں مشکل پیش آتی ہے، انھیں سیاق و سباق کے ساتھ ملا کر اگر پڑھا جائے تو ایک عام قاری بھی ان سے مطلب و معنی اخذ کرسکتا ہے۔ مجموعی حیثیت میں یہ تراجم اُردو سندھی دونوں زبانوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے دونوں زبانوں کو نہ صرف ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا بلکہ یہ اُردو اور سندھی دونوں ادب کو وسعت دینے کا باعث بھی بنیں گے۔

**VII۔ ماہتاب محبوب:۔**

ماہتاب محبوب (پ۔۱۹۵۰ء) سندھی زبان کی معروف و مشہور ادیبہ ہیں۔ اس زبان میں ان کی اب تک بارہ (۱۲) کتابیں جو ناول، افسانوں اور سفرناموں پر مشتمل ہیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جب کہ ایک کتاب ''پل صراط'' جو انھی کے سندھی افسانوں کا اُردو ترجمہ ہے، ارم پبلیکیشنز حیدرآباد نے ۱۹۸۵ء میں شایع کی۔ یوں تو ان کے سندھی افسانوں کے اور بہت سے لوگوں نے اُردو ترجمے کیے ہیں، لیکن وہ ان سے مطمئن نہ تھیں، اسی بناء پر انھوں نے اپنے افسانوں کا ترجمہ خود کرنے کا فیصلہ کیا، اس حوالے سے وہ کتاب ''پل صراط'' کے ''پیش لفظ'' میں لکھتی ہیں:

> ''جب میں نے اپنی کہانیوں کے اُردو ترجمے اخبارات اور رسائل میں دیکھے تو مجھے احساس ہوا کہ میری کہانیوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، اس قدر ناانصافی کہ کہیں تو کہانی کا مقصد ہی فوت ہوجاتا اور کئی کئی واقعات سرے سے غائب ہوتے۔ میں اس صورتِ حال سے پریشان تھی کہ خالد اطہر صاحب جو ہر وقت سندھ کا حق ادا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، مجھے اپنی کہانیوں کو اُردو میں ڈھالنے کا پُرخلوص مشورہ دیا''۔(ص:۸)

مذکورہ پیش لفظ میں آگے چل کر انھوں نے اس بات کا برملا اعتراف بھی کیا ہے کہ اُردو ترجمے کی نوک پلک سنوارنے میں خالد اطہر صاحب نے بے حد تعاون کیا۔ مذکورہ کتاب میں کل دس افسانے اور کہانیاں ہیں، جن کے عنوانات یہ ہیں:

> ''چاندی کی زنجیر''، ''ناک''، ''دلی مراد''، ''تحقیقات''، ''پل صراط''، ''فضل بھیّا''، ''داشتہ''، ''جالا''،[۳۳] ''ناسور'' اور ''سمدھنیں''۔

ماہتاب محبوب ایک خاتون ہونے کے ناتے بہتر طور پر جانتی ہیں کہ عورتوں کے مسائل و مصائب کیا ہیں، وہ کس طرح ظلم و بربریت کا شکار ہوتی ہیں، پرانی رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں، مردوں کے معاشرے میں اپنے مقام و مرتبے کے حصول میں کس قدر کوشاں رہتی ہیں، عورتیں ہی عورتوں کے حقوق پر کیسے ڈاکہ ڈالتی ہیں، ان معاملات کی حساسیت کو محسوس کرتے ہوئے ماہتاب محبوب نے اپنے افسانوں میں انھی موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور انھیں بڑی مہارت، چابکدستی اور فنِ افسانہ کے عین مطابق ترجموں میں بھی پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے مذکورہ کتاب میں شامل ''چاندی کی زنجیر'' سے ایک اقتباس

جس میں پھوپھی اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا بدلہ اپنی بھتیجی سے لے رہی ہے:

''میں بھی تو سات بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ مجھے گھلا کر ہڈیوں کا ڈھانچہ کر دیا اس وقت تو کہتے تھے کہ ایسا کون سا جوان پیدا ہوا ہے جو پگڑی باندھ کر ہمارے بیچ بیٹھے؟ ہم ساتوں بھائی کیا مر گئے ہیں!

ہماری جان بھی تمھارے لیے حاضر ہے۔ اپنے گھر میں بیٹھ کر راج کرو۔ اب اپنی اولاد کی بات آئی ہے تو اس کا بوجھ اُتارنے کا کیسا احساس اُمنڈ آیا ہے۔ فکروں میں گھلے جا رہے ہو۔ میں بھی مری نہیں ہوں، ابھی زندہ ہوں، تم بھی خوش مت ہونا بھابھی کہ راحت ڈولی میں بیٹھے گی اور تم اسے اپنی آنکھوں سے رخصت ہوتے دیکھو گی، میرے جیتے جی یہ ہرگز نہیں ہوسکتا!''۔(ص:۴۳۔۴۴)

ماہتاب محبوب کا ان تراجم کے علاوہ اُردو زبان میں کوئی اور قابلِ ذکر کام سامنے نہیں آیا لیکن انھوں نے پھر بھی ان تراجم میں پوری کوشش کی ہے کہ اُردو زبان کو اس کے صحیح محاورے اور روزمرہ کے تحت بیان کیا جائے اور اس کے ادبی اسلوب میں کہیں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ بے شک انھوں نے زبان و بیان کی درستی کے لیے جیسا کہ اقتباس میں بیان کیا گیا ہے، خالد اطہر صاحب سے مدد لی ہے مگر ترجمے میں زیادہ تر کوشش اور محنت انھی کی نظر آتی ہے، سندھی فکشن پر ان کی کمال مہارت نے اس کام کو مزید آسان کر دیا ہوگا، یوں بھی دیکھا جائے تو ان کی تخلیق اور ترجمے میں معمولی فرق ہے یعنی پہلے انھوں نے اپنی افسانوی تخلیق کے ذریعۂ اظہار کے لیے سندھی زبان کو اختیار کیا بعد میں اُسے اُردو میں تبدیل کر دیا، اُردو زبان پر مکمل دسترس نہ ہونے کی وجہ سے ان کو کچھ دشواریاں ضرور آئی ہیں جیسے بعض جملے یا مکالمے اُردو قاعدے کی بجائے سندھی قاعدے میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔ تذکیر و تانیث اور املا کی بھی بعض خامیاں ہیں۔ اسی طرح سندھی کے بعض الفاظ مثال کے طور پر قبر ٹوٹیو، بھوپا، نائن، تین سریاں، ڈھوکی، فقّٹے، سوداشتائیں، جنڈی، حرفت، بھاگوں بھری وغیرہ کا اُردو ترجمہ نہیں ہوسکا، البتہ تین چار لفظوں کا محل و وضاحت اور معنی حواشی میں ضرور پیش کیے ہیں۔

مجموعی طور پر تمام ترجموں میں بیان کا انداز سادہ اور رواں ہے، زبان بھی مذکورہ خامیوں کے علاوہ سلیس اور عام فہم استعمال کی ہے۔ سندھی کے بعض محاوروں اور کہاوتوں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ اُردو کے پیرائے میں منتقل کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کتاب ''پل صراط'' سے چند مثالیں:

''گدھی کو بھی کبھی ہار پہنائے جاتے ہیں''۔(ص:۶۳)

''کوے کے پر سونے کے ہوتے تو اُڑنے میں نظر آتے''۔(ص:۶۴)

''بڑھیا کسی کو جلی روٹی کا چھلکا تک دینا گوارا نہیں کرتی تھی''۔(ص:۱۰۸)

''ہے نصیب! کتا بھی کھایا، کوکھ بھی نہ بھری!''۔(ص:۱۲۸)

''بوڑھے منہ مہاسے، لوگ بنے تماشے''۔(ص:۱۲۹)

''خالی جان بچوں پر قربان''۔(ص:۱۳۴)

''دودھ گرا بھی تو چاولوں میں''۔(ص:۱۴۶)

اس کے علاوہ ان کی افسانوی طرز، چھوٹے چھوٹے مکالمے، عمدہ تشبیہات اور سندھ کے ماحول کی بھرپور عکاسی نے ان تراجم کو نہ صرف دلچسپ اور مؤثر بنایا ہے بلکہ قاری کو سندھ کی معاشرت سے بھی بہ خوبی آشنا کیا ہے۔تشبیہات سے متعلق کتاب ''پل صراط'' مزید مثالیں دیکھیے:

''بوڑھی مگر کنواری پھوپھی جہاں آرا کے دانت کسی دروازے کے ڈھیلے کواڑوں کی طرح حرکت میں آئے اور وہ تڑخ کر بولی''۔(ص:۴۰)

''چھلے ہوئے بادام جیسی رنگت اور کجراری آنکھوں والے دلکش چہرے پر ناک میں پڑی ہوئی سات رنگوں والی لونگ مشعل کی لو کی طرح جگ مگ کر رہی تھی۔ انتہائی پُرسکون مسکراہٹ اس کے صحت مند ہونٹوں پر بکھر گئی''۔(ص:۱۱۹)

ماہتاب محبوب کے یہ تراجم اردو ادب میں نہ صرف اہمیت کے حامل ہیں بلکہ یہ لسانی رشتوں اور ادبی رابطوں کو بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جناب آفاق صدیقی مذکورہ کتاب میں ''روشنی کا سفر'' کے عنوان سے ماہتاب محبوب کی ترجمہ نگاری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سندھی کی قدیم و جدید لفظیات اور روزمرہ محاوروں کا استعمال وہ اپنی تحریروں میں بڑی خوب صورتی سے کرتی رہی ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے جس عمدگی سے اپنی چند کہانیوں کو اُردو میں منتقل کیا ہے وہ بہرطور یہ تاثر دیتی ہے کہ وہ کسی صاحب زبان جیسی صلاحیت رکھتی ہیں۔ خاص طور پر انھوں نے ان کہانیوں میں بعض ٹھیٹ سندھی محاوروں کے اُردو متبادل محاورے جس خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیے ہیں وہ کوئی اہلِ زبان ہی کرسکتا ہے''۔(ص:۲۲)

## حواشی

۱۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ترجمے کا فن (نظری مباحث ۴۶ قبل مسیح تا ۱۹۸۶ء)، (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۵ء)،

ص ۲۸

۲۔ انیس ناگی، ترجمے کی ضرورت، مشمولہ ترجمہ: روایت اور فن، مرتبہ: نثار احمد قریشی، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء)، ص ۳۵، ۳۶

۳۔ شرف الدین اصلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۵۲

۴۔ ایضاً، ص ۸۸

۵۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، سندھی افسانہ، مشمولہ بہم لوگ، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۷ء)، ص ۴۶

۶۔ ایضاً: ص ۴۶

۷۔ رسالہ ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

۸۔ رسالہ صریر، کراچی، اکتوبر، ۱۹۹۵ء

۹۔ رسالہ ابلاغ، نوشہرہ، جنوری ۱۹۹۵ء

۱۰۔ رسالہ تحریریں، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء اور رسالہ طلوعِ افکار، کراچی، جون، ۱۹۹۰ء

۱۱۔ رسالہ محفل، لاہور، اگست، ۱۹۹۵ء اور رسالہ کندن، کراچی، مئی جون ۱۹۹۲ء

۱۲۔ ایضاً، اپریل ۱۹۹۳ء

۱۳۔ رسالہ نئی عبارت، حیدرآباد، اپریل تا جون، ۱۹۹۶ء

۱۴۔ رسالہ نئی قدریں، حیدرآباد، شمارہ (۵۔۶)، ۱۹۷۳ء

۱۵۔ رسالہ پندرہویں صدی، گجرانوالہ، مئی ۱۹۹۳ء اور رسالہ کندن کراچی، فروری ۱۹۹۱ء

۱۶۔ رسالہ ابلاغ، نوشہرہ، اپریل ۱۹۹۰ء، رسالہ اہلِ قلم، ملتان، شمارہ (۱۱)، ۱۹۹۰ء اور رسالہ ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۱۷۔ رسالہ راز، کراچی، مارچ ۱۹۹۳ء

۱۸۔ رسالہ ماہِ نو، کراچی، دسمبر ۱۹۷۹ء

۱۹۔ رسالہ آگہی، کراچی، جنوری ۱۹۹۳ء

۲۰۔ رسالہ قومی زبان، کراچی، جون ۱۹۹۶ء

۲۱۔ رسالہ انشاء، حیدرآباد، جنوری تا جون ۱۹۹۶ء

۲۲۔ پروفیسر آفاق صدیقی، لسانی رابطے۔ ادبی رشتے، مشمولہ بہم لوگ، ص ۳۴۔۳۵

۲۳۔ یہ تراجم روزنامہ جنگ کراچی کے مڈویک میں بھی شایع ہوتے رہے ہیں۔

۲۴۔ رسالہ تخلیق، لاہور (سندھی ادب و ثقافت نمبر)، ۱۹۸۸ء

۲۵۔ رسالہ نئی قدریں، حیدرآباد، شمارہ (۶۔۵)، ۱۹۷۳ء

۲۶۔ ایضاً، شمارہ (۱۲۔۱۱)، ۱۹۷۴ء

۲۷۔ ڈاکٹر سعدیہ نسیم، تراجم کی اہمیت و افادیت اور سندھی لوک کہانیوں کے اُردو تراجم، لوک کہانیاں (حصہ اوّل)، جام شورو، سندھی ادبی بورڈ، ۲۰۰۷ء، ص: ۳۰

۲۸۔ رسالہ تجسّس، کوٹری، اگست ۲۰۰۷ء۔

۲۹۔ رسالہ تخلیق، لاہور، (سندھی ادب و ثقافت نمبر)، ۱۹۸۸ء

۳۰۔ رسالہ نئی قدریں، حیدرآباد، شمارہ (۹۔۸)، ۱۹۸۴ء
۳۱۔ ہندکو کہانی کا یہ ترجمہ غالباً انگریزی سے کیا گیا ہے۔ کسی دوسری زبان کے حوالے سے اس کا یہاں محل نہیں ہے مگر چوں کہ یہ ڈاکٹر سعدیہ نسیم کا دوسری زبان میں صرف ایک ترجمہ ہے اس لیے اسے یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔
۳۲۔ رسالہ قومی زبان کراچی، جولائی ۱۹۸۲ء
۳۳۔ رسالہ ماہِ نو لاہور، (چالیس سالہ مخزن)، جلد اوّل، ۱۹۸۷ء۔

## مآخذ:


۱۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، امجد، رشید، ڈاکٹر (مرتبین)، پاکستانی ادب، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء
۲۔ اصلاحی، شرف الدین، اردو سندھی کے لسانی روابط، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
۳۔ بیگ، سلیم، مرزا (مرتب)، قاضی خادم کے افسانے، حیدرآباد: مکتبہ نئی قدریں، ۲۰۰۰ء
۴۔ بیگ، حامد، مرزا، ڈاکٹر، ترجمے کا فن (نظری مباحث ۴۶ قبل مسیح تا ۱۹۸۶ء)، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۵ء
۵۔ بلوچ، نبی بخش، ڈاکٹر (نگراں)، لوک کہانیاں (حصّہ اول)، جام شورو: سندھی ادبی بورڈ، ۲۰۰۷ء
۶۔ جوہر، نعیم الرحمٰن (مترجم)، نورِ نبوت، حیدرآباد: سلیم انٹر پرائزز، ۲۰۰۰ء
۷۔ حسینی، امداد (مترجم)، دودو چنیسر، اسلام آباد: لوک ورثہ، ۱۹۷۵ء
۸۔ ـــــــ، زینت (سندھی ناول)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۰ء
۹۔ ڈیپلائی، ثریا سوز (مترجم)، سانگھڑ (سندھی ناول)، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء
۱۰۔ سندھی، حمید (مرتب)، سو کھی دھرتی، کراچی: کلاسکس، ۱۹۸۷ء
۱۱۔ قریشی، نثار احمد (مرتب)، ترجمہ: روایت اور فن، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
۱۲۔ کاسنگجوی، حسرت، ڈاکٹر، ہم لوگ، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۷ء
۱۳۔ محبوب، ماہتاب (مترجم)، پل صراط، حیدرآباد: ارم پبلیکیشنز، ۱۹۸۵ء


### جرائد و اخبارات


۱۔ آگہی، کراچی، جنوری ۱۹۹۳ء
۲۔ ابلاغ، نوشہرہ، اپریل ۱۹۹۰ء، جنوری ۱۹۹۵ء
۳۔ ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۹ء
۴۔ اظہار، کراچی، مارچ اپریل ۱۹۸۴ء
۵۔ انشاء، حیدرآباد، جنوری تا جون ۱۹۹۶ء
۶۔ اہلِ قلم، ملتان، شمارہ (۱۱)، ۱۹۹۰ء
۷۔ پرکھ، جام شورو، شعبۂ اردو، جامعۂ سندھ (پاکستانی ادب نمبر) ۱۹۷۸ء
۸۔ پندرھویں صدی، گجرانوالہ، مئی ۱۹۹۳ء

۹۔ تجسس، کوٹری، اگست ۲۰۰۷ء
۱۰۔ تحریریں، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء
۱۱۔ تخلیق، لاہور، (سندھی ادب و ثقافت نمبر)، ۱۹۸۸ء
۱۲۔ جنگ، کراچی، ۲۰ نومبر ۱۹۷۵، ۴ اپریل ۱۹۸۴ء
۱۳۔ راز، کراچی، مارچ ۱۹۹۳ء
۱۴۔ صریر، کراچی، اکتوبر، ۱۹۹۵ء
۱۵۔ طلوعِ افکار، کراچی، جون، ۱۹۹۰ء
۱۶۔ قومی زبان، کراچی، جولائی ۱۹۸۲ء، دسمبر ۱۹۸۴ء، دسمبر ۱۹۹۴ء، جون ۱۹۹۶ء
۱۷۔ کندن، کراچی، فروری ۱۹۹۱ء، مئی جون ۱۹۹۲ء
۱۸۔ ماہِ نو، کراچی، دسمبر ۱۹۷۹ء
۱۹۔ ماہِ نو، لاہور، (چالیس سالہ مخزن نمبر)، جلد اوّل، ۱۹۸۷ء، جنوری ۱۹۹۵ء
۲۰۔ محفل، لاہور، اپریل ۱۹۹۳ء، اگست، ۱۹۹۵ء
۲۱۔ نئی عبارت، حیدرآباد، اپریل تا جون، ۱۹۹۶ء
۲۲۔ نئی قدریں، حیدرآباد، شمارہ (۶۔۵) ۱۹۷۳ء، شمارہ (۹۔۸) ۱۹۷۳ء، شمارہ (۱۲۔۱۱) ۱۹۷۳ء، شمارہ (۳۔۲) ۱۹۷۴ء، شمارہ (۶۔۵) ۱۹۷۴ء، شمارہ (۹۔۸) ۱۹۷۴ء، شمارہ (۱۲۔۱۱) ۱۹۷۴ء، شمارہ (۲۔۱) ۱۹۷۵ء، شمارہ (۸۔۷) ۱۹۷۵ء، شمارہ (۱۱۔۱۰) ۱۹۷۵ء، شمارہ (۹۔۸) ۱۹۸۳ء، (۳۔۴)، ۱۹۹۴ء